گرمیوں کا موسم تھا لیکن آج شام ہونے والی بارش کے بعد ہوا میں خوشگوار ٹھنڈک تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جمیل احمد صاحب کی مرسیڈیز کار کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ جو کربناک چیخ پھلواری کی طرف سے اُبھری، وہ ان اَدھ کھلی کھڑکیوں کے سبب ہی جمیل صاحب کے کانوں تک پہنچی تھی۔ یہ کوئی نوجوان عورت یا لڑکی تھی۔

''ڈرائیور گاڑی روکو!'' جمیل احمد نے تیزی سے کہا۔

گاڑی کچھ دور آگے جا کر رُک گئی۔ ڈرائیور نے بھی غالباً عورت کے چلانے کی آواز سن لی تھی اور وہ تھوڑا سا چونکا ہوا نظر آتا تھا۔ گاڑی ریورس ہو کر پھولوں کی نرسری کے عین سامنے پہنچی۔ اندھیرے میں نرسری کے اندر جمیل احمد کو تین سائے نظر آئے۔ ان میں سے ایک کسی لڑکی کا تھا۔ دو مرد اسے کھینچتے ہوئے نیچی چھت والے ایک کمرے کی طرف لے جا رہے تھے۔ لڑکی کا گلا گھونٹا گیا تھا یا پھر اس کے منہ کو مضبوطی سے بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے بس گھٹی گھٹی آوازیں ہی نکل پا رہی تھیں۔ لہجے سے عیاں تھا کہ وہ دونوں مردوں کی منت سماجت کر رہی ہے۔

تین چار سیکنڈ کے اندر ہی یہ منظر جمیل احمد کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ تینوں سائے نرسری کے کمرے کے اندر اوجھل ہو گئے۔ جمیل احمد کے لیے اب گاڑی میں رُکنا ممکن

# پناہ

Qaafqalam.com

طاہر جاوید مغل

جسے چوٹ لگتی ہے ..... درد بھی وہی محسوس کرسکتا ہے ..... وہ درد جو احساس میں جاگزیں رہتا ہے ..... کبھی بڑھتا ہے تو اذیت وکرب سے دوچار کرتا ہے اور جب کم ہوجائے تب بھی ایک کسک، ایک پھانس کی صورت کہیں نہ کہیں اپنا احساس جگاتا رہتا ہے ..... ایسے درد کی دوا صرف کسی دوسرے کے درد کے احساس میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

**اس جوڑے کی داستان پرغم جسے ذرا سی رومانی تنہائی درکار تھی۔**

Scanned by CamScanner

نہیں تھا۔ وہ ڈرائیور سمیت باہر نکل آئے۔ جمیل احمد صاحب کی عمر باسٹھ کے لگ بھگ تھی۔ کنپٹیوں سے تمام بال سفید ہو چکے تھے۔ قیمتی لباس ان کے چھریرے جسم پر جچ رہا تھا۔ وہ اپنے تنومند ڈرائیور محمد عباس کے ساتھ تیزی سے نرسری میں داخل ہوئے۔ یہ شہر کا نواحی علاقہ تھا۔ سکھیاں پل سے لاہور کی آبادی میں داخل ہوتے ہوئے یہ نرسری سڑک کی بائیں جانب نشیب میں واقع تھی۔ یہ کافی بڑی جگہ تھی، ہر طرف چھوٹے بڑے درختوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ نرسری کے وسط میں اس تنہا کمرے کے اندر ہلکی سی روشنی تھی۔

جمیل احمد کی تیسری زوردار دستک پر کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک پہلوان نما شخص جلدی سے باہر نکل آیا۔ اس نے دروازہ اپنے عقب میں بند کر دیا تھا۔ ''کیا بات ہے باؤ جی؟'' اس نے ذرا اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

''اندر کون ہے؟'' جمیل احمد نے پوچھا۔

''کوئی نہیں..... مم..... میرے گھر والے ہیں۔''

اچانک اندر سے پھر لڑکی کے چلانے کی دبی دبی آواز اُبھری۔

''یہ کون ہے؟'' جمیل احمد نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

''یہ..... دراصل..... یہ۔'' پہلوان نما ہکلا کر رہ گیا۔

''تم لوگ اس سے زبردستی کر رہے ہو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' جمیل احمد کا انداز بارُعب تھا۔

اسی دوران میں کمرے کا دروازہ کھل گیا اور دوسرا شخص بھی باہر آ گیا۔ یہ بھی ایک ہٹا کٹا شخص تھا تاہم جواں سال پہلوان کے برعکس یہ ادھیڑ عمر تھا۔ اس نے قبول صورت لڑکی کو بڑی بے دردی کے ساتھ بالوں اور ایک بازو سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

''جناب! ہم نے ان دونوں کو نرسری کے پچھلے باغیچے سے پکڑا ہے جی۔''

جمیل احمد چونک گئے۔ ''کیا کوئی دوسری لڑکی بھی ہے؟''

''لڑکی نہیں جی، منڈا ہے۔ دونوں وہاں رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ لگتا ہے کہ گھر سے بھاگ کر آئے ہیں۔ ان کی عمریں دیکھو اور کرتوت دیکھو۔ ہم تو ٹیلی فون کر رہے تھے تھانے میں ان کو پولیس کے حوالے کرنے کے لیے۔'' پہلوان نما شخص نے کہا۔

لڑکی ایک دم چیخ کر بولی۔ ''یہ جھوٹ بول رہا ہے جی۔ بکواس کرتا ہے..... یہ میرے ساتھ..... یہ میرے ساتھ.....'' لڑکی کی آواز بھرا گئی اور وہ کوشش کے باوجود فقرہ مکمل نہ کر سکی۔ اپنے آزاد بازو میں چہرہ چھپا کر سسکنے لگی۔

لڑکی کی عمر بمشکل اٹھارہ انیس سال رہی ہوگی۔ بھولپن کی وجہ سے وہ اور بھی کم عمر دکھائی دیتی تھی۔ اس کے لباس اور لب و لہجے سے جمیل احمد کو اندازہ ہوا کہ وہ کسی چھوٹے شہر یا قصبے سے لاہور میں وارد ہوئی ہے۔ اس کی گلابی پھولدار قمیص کندھے سے پھٹ گئی تھی اور حالات کی شم ظریفی بیان کر رہی تھی۔

جمیل احمد کے اندر ایک لاوا سا دہک گیا۔ انہوں نے پہلوان نما شخص کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''لڑکا کدھر ہے؟''

''وہ..... وہ اس سامنے والے کوٹھے میں۔'' ادھیڑ عمر شخص نے دائیں طرف نرسری کی پانچ چھ فٹ اُونچی حد بندی کی طرف اشارہ کیا۔

یہاں بھی ایک کمرا موجود تھا۔ ایسے کمرے نرسریوں میں کھاد، بیج، ادویات اور دیگر سامان رکھنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔

''لڑکے کو وہاں بند کیا ہوا ہے؟'' جمیل احمد نے پوچھا۔

''جی ہاں، بڑا اتھرا ہے جی وہ بھی۔ دھمکیاں دے رہا تھا۔'' ادھیڑ عمر نے کہا۔

لڑکے کو علیحدہ بند کرنا صاف طور پر نرسری والوں کی بدنیتی ظاہر کر رہا تھا۔ وہ اس ڈرے سہمے جوڑے کو ڈرا دھمکا کر حرص و ہوس کا وہی جانا پہچانا کھیل کھیلنا چاہ رہے تھے۔ بصد شکر جمیل احمد اس نرسری کے پاس سے گزر رہے تھے اور بصد شکر ان کی گاڑی کی کھڑکیاں اُدھ کھلی تھیں۔ ورنہ شاید اب تک یہ نوخیز لڑکی بے دست و پا ہو چکی ہوتی..... اور گھر سے بھاگنے کی ''بدترین سزا'' اس کے لیے شروع ہو چکی ہوتی۔

جمیل احمد کی متاثر کن شخصیت اور ان کی لمبی گاڑی اور باوردی ڈرائیور نے نرسری والوں کو بری طرح مرعوب کر دیا تھا۔ وہ اپنی مستی بھول کر اب کھال بچانے کی فکر میں نظر آتے تھے۔ جمیل احمد صاحب کے پیچھے ہی پیچھے ایک گاڑی میں ان کا منیجر اشفاق اور دو تین ملازم بھی آ رہے تھے۔

جمیل صاحب نے وہیں کھڑے کھڑے منیجر اشفاق کا موبائل نمبر ملایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ پل سے ایک فرلانگ کی دوری پر ''خدا بخش نرسری'' کے سامنے آ کر گاڑی روک لے۔

جمیل احمد صاحب کی اس فون کال نے پہلوان نما اور اس کے ساتھی کو مزید ڈرا دیا۔ وہ اپنی صفائیاں پیش کرنے لگ گئے جبکہ لڑکی ان کی صفائیوں کو رد کرتی رہی۔ اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے واضح طور پر بتا دیا کہ پہلوان نما شخص جس کا نام

قادر ہے اس کے کپڑے اُتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسی دوران میں حد بندی کے ساتھ والے کمرے کا دروازہ بھی اندر سے دھڑ دھڑ بجایا جانے لگا۔ یہاں لڑکے کو رکھا گیا تھا۔ جمیل احمد نے اپنے سامنے دروازہ کھلوایا۔ ایک دُبلا پتلا لڑکا برآمد ہوا۔ اس کی عمر بھی بمشکل انیس بیس سال رہی ہوگی۔ اس کا پھٹا ہوا گریبان اور سوجی ہوئی ناک اس بات کے گواہ تھے کہ اسے مارا پیٹا گیا ہے۔ رو رو کر لڑکے کی آنکھیں متورم ہوگئی تھیں۔

جمیل احمد اور ڈرائیور تاریکی میں کھڑے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی لڑکے کو قادر اور اس کا ساتھی ہی دکھائی دیے۔ وہ بلک کر اور ہاتھ جوڑ کر قادر سے مخاطب ہوا۔ ''پہلوان جی، ہم کو معاف کردیں۔ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ ہم تو بس..... ہم تو بس ذرا سا (سانس) لینے کے لیے رُک گئے تھے۔''

تب لڑکے کی نگاہ جمیل احمد اور ڈرائیور پر پڑی۔ وہ مزید ڈر گیا۔ جمیل احمد نے آگے بڑھ کر لڑکے کو تسلی دی اور اسے لے کر پہلے والے کمرے میں آگئے۔ یہاں ڈری سہمی لڑکی بھی موجود تھی۔ لڑکے کو دیکھ کر وہ سسکنے لگی۔ لڑکے کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔

اسی دوران میں جمیل احمد کا منیجر اشفاق اور دیگر ملازم بھی موقع پر پہنچ گئے۔ جمیل احمد نے پہلے لڑکے اور لڑکی کو بولنے کا موقع دیا اور ان کی پوری بات سنی۔ اس کے بعد نرسری کے مالک قادر اور اس کے ملازم بشیرے کی وضاحتیں سنی گئیں۔ اس سارے بحث مباحثے اور گفت و شنید سے حالات کی اصل تصویر سامنے آگئی۔ یہ تصویر کچھ یوں تھی۔

لڑکے کا نام اعجاز اور لڑکی کا نادیہ تھا۔ یہ دونوں ماموں اور پھوپی زاد تھے۔ ان کی رہائش لاہور کے ایک نواحی قصبے ایمن آباد کی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے بزرگوں نے دونوں کی منگنی کی تھی لیکن بعد میں بزرگ آپس میں ناچاقی کا شکار ہوگئے۔ اعجاز کے والدین نے منگنی توڑ دی لیکن اعجاز اور نادیہ ایک دوسرے کے قریب آچکے تھے۔ اب ان کے لیے واپسی کا راستہ کہیں نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے کو پانا چاہتے تھے۔ وہی پرانی کشمکش، وہی جانا پہچانا خارزار۔ حالات سنبھلنے کے بجائے بگڑتے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ نادیہ کی بات کہیں اور چل نکلی۔ اب ان دونوں کے لیے مزید انتظار ممکن نہیں تھا۔ وہ دونوں سب کچھ چھوڑ کر ایمن آباد سے نکل آئے۔ ان کی منزل روشنیوں کا شہر لاہور تھی۔ لاہور میں اعجاز کا ایک دوست تھا۔ اعجاز کو اُمید تھی کہ وہ اس مشکل موقع پر اس کا بھرپور ساتھ دے گا اور چند دن کے لیے انہیں اس کے پاس پناہ مل جائے گی لیکن یہ دوست بزدل ثابت ہوا تھا۔ اعجاز اور نادیہ کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ گھر سے کہیں نکل گیا تھا۔ اعجاز اور نادیہ نے رات جیسے تیسے داتا دربار میں گزاری تھی۔ آج اعجاز اپنے ایک پرانے کلاس فیلو کی تلاش میں نکلا ہوا تھا..... اس کی رہائش بندر روڈ کے علاقے میں تھی لیکن فی الحال اس کا بھی کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ اعجاز اور نادیہ بھوکے پیاسے و پریشان حال تھے۔ اسی پریشانی میں وہ اس نرسری کے پاس سے گزر رہے تھے۔ دو گھڑی دم لینے کے لیے وہ یہاں جامن کے باغ میں رُکے اور قادر وغیرہ کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔

قادر اور بشیرے نے خستہ حال جوڑے کو بری طرح ڈرایا دھمکایا تھا..... اور دونوں کو پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی تھی۔ قادر کی نیت واضح طور پر خراب تھی۔ وہ نوعمر نادیہ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس موقع پر لڑکے اعجاز نے تھوڑی سی مزاحمت کی، نتیجے میں قادر اور بشیرے نے اسے گھونسے مارے..... اور کمرے میں بند کردیا۔ قادر نے نوعمر اعجاز کو مزید ڈرانے کے لیے بڑ ماری کہ وہ مقامی ناظم کا بھائی ہے..... اور اس کے ایک فون پر پولیس بھاگی بھاگی یہاں پہنچ جائے گی۔ اعجاز کو بند کرنے کے بعد قادر اور


خانم بیوٹی ہوم کے فارمولا F.5 سے ایسی لڑکیاں و خواتین مستفید ہوچکی ہیں جن کے چہرے وکلائیوں پر فاضل بال تھے آپ اس تکلیف میں مبتلا ہوں تو اب آپکو تھریڈنگ ویکسنگ کی ضرورت نہیں ایک خط لکھ کر فارمولا F.5 وی پی پارسل سے طلب کریں۔ قیمت معہ محصول ڈاک 400 روپے۔ بیوٹی پارلر بھی رابطہ کریں

قد میں اضافہ ممکن ہے

بے اولاد خواتین ماں بن سکتی ہیں

خانم بیوٹی ہوم کا شعبہ، خواتین ایسی لڑکیوں وخواتین کو مشورہ فراہم کرتا ہے جو کسی پوشیدہ تکلیف میں مبتلا ہوں نیز ایسی لڑکیاں یا لڑکے جو پستہ قد ہوں مشورہ کیلئے ایک خط معہ جوابی لفافے کے لکھیں

پوسٹ بکس نمبر 2535 کراچی 74600

بشیرے پر شیطانیت سوار ہوگئی۔

ساری صورتِ حال کو سمجھنے اور جاننے کے بعد جمیل احمد بالکل گم صُم سے ہوگئے۔ ان کے پتلے پتلے ہونٹ مضبوطی سے بند تھے اور چہرہ چٹان کی طرح سخت تھا پھر ایک دم نجانے کیا ہوا، جمیل احمد غضب سے مغلوب ہوکر اُٹھے اور پہلوان نما قادر پر پل پڑے۔ ان کا یہ عمل اتنا غیر متوقع اور حیران کن تھا۔ کہ ان کے ساتھی ششدر رہ گئے۔ جمیل احمد ہاتھا پائی کرنے والے شخص نہیں تھے بلکہ وہ تو کسی سے اُونچی آواز میں بات بھی نہیں کرتے تھے۔ کہاں یہ کہ وہ اپنی حیثیت اور مرتبے کی پروا کیے بغیر چلاتے ہوئے قادر پر جھپٹ پڑے تھے اور اسے بے دریغ لاتوں، گھونسوں اور تھپڑوں سے مارنے لگے تھے۔

قادر پہلے ہی ڈرا ہوا تھا۔ اس اچانک ٹوٹنے والی آفت نے اسے مزید حواس باختہ کردیا۔ وہ زمین پر گر پڑا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اسی دوران میں جمیل احمد کے ہاتھ میں ایک کسی آگئی۔ وہ کسّی کے اُلٹے رُخ سے قادر کو بے دریغ ضربیں لگانے لگے۔ اپنے باس کو مصروف کار دیکھ کر منیجر اشفاق نے بھی قادر کو چند زوردار ٹھوکریں رسید کیں لیکن جب اس نے اپنے باس کا شدید ترین رویہ دیکھا تو ان کا ہاتھ بٹانے کے بجائے انہیں روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں کسی کی کوئی شدید ضرب پیٹنے والے کی جان ہی نہ لے لے۔ قادر کے ملازم نے مالک کی دُرگت دیکھ کر بھاگ جانے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔

چند منٹ بعد جب جمیل صاحب کو قادر سے بمشکل علیحدہ کیا گیا تو قادر کا لباس تار تار ہوچکا تھا اور اس کے جسم کے کئی زخم خون اُگل رہے تھے۔ اس کی ایک کلائی بھی بری طرح لرزتی جارہی تھی۔ شاید کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ رو رو کر اپنی جان کی امان مانگ رہا تھا۔

☆☆☆

جمیل احمد اپنے گھر واپس پہنچ چکے تھے۔ گارڈن ٹاؤن کے ایک پُرسکون حصے میں واقع ان کا گھر قریباً چھ کینال رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ اوپن ایریا تھوڑا تھا لیکن خوبصورت تھا۔ یہ دومنزلہ عمارت تھی۔ اس عمارت میں کم و بیش بیس بیڈروم تھے لیکن ایک بیڈروم کے سوا کوئی آباد نہیں تھا اور اس آباد بیڈروم میں بھی جمیل احمد تنہا ہی ہوتے تھے۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ زندگی کی باسٹھ بہاریں دیکھنے کے باوجود ان کی زندگی بہار سے خالی تھی اور اب تو اس خالی پن کا احساس بھی ختم ہوچکا تھا۔ کبھی کبھی انہیں محسوس ہوتا تھا کہ ان کی زندگی میں شاید کوئی خلا ہے ہی نہیں۔ انہوں نے خود کو اپنے بزنس میں گم کرلیا تھا یا شاید یہ بزنس تھا جس نے انہیں خود میں سمویا ہوا تھا۔ وہ ایک ''اسٹیٹ ڈویلپر'' تھے۔ انہوں نے لاہور کے کشادہ علاقوں میں کئی خوبصورت رہائشی کالونیاں بنائی تھیں اور کامیابی سے فروخت کی تھیں۔ اب ایک کامیاب ''بلڈر'' کی حیثیت سے ان کا نام متعلقہ حلقوں میں نمایاں ترین تھا۔ انہیں اب دولت کی کمی نہیں تھی، نہ ہی ان کے زرخیز ذہن میں نئے رہائشی منصوبوں کی کمی تھی..... لندن اور کیلے فورنیا جیسے شہروں میں جمیل احمد کے ذاتی فلیٹ موجود تھے۔ ان کے گیراج میں نت نئے ماڈل کی گاڑیاں موجود رہتی تھیں اور نوکروں کی فوج ظفر موج ان کے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ گارڈن ٹاؤن کے جس عظیم الشان گھر میں جمیل احمد رہتے تھے اسے یار لوگ مذاق سے ''روم ہاؤس'' کہتے تھے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اس عمارت میں روم ہی روم یعنی کمرے ہی کمرے تھے۔ بیڈرومز کو ملا کر کل کمروں کی تعداد چالیس سے کم نہیں تھی لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ کمروں کی زیادتی سے عمارت کی خوبصورتی متاثر ہوئی ہو۔ یہ جمیل احمد کا فن تھا۔ وہ کسی بھی طرح کی عمارت اور کسی بھی طرح کے نقشے میں جان ڈال دیتے تھے۔ ہاؤس بلڈنگ میں انہیں خداداد ملکا حاصل تھا اور اس کا ثبوت ان کی تیار کردہ شاندار رہائشی کالونیاں تھیں۔

گارڈن ٹاؤن کے اپنے روم ہاؤس میں انہوں نے اتنے زیادہ کمرے کیوں بنائے تھے اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ بہرطور وہ ایک موڈی شخص تھے اور بسا اوقات کسی آرٹسٹ کی طرح اپنے موڈ کے زیرِ اثر کام کرتے تھے۔ ایسے لوگ خود کو کسی کے سامنے جوابدہ کب سمجھتے ہیں۔

جمیل صاحب اپنے وسیع بیڈروم میں آکر صوفے پر نیم دراز ہوگئے۔ کھڑکیوں پر دبیز پردے تھے اور ان پردوں سے باہر لاہور کی ایک نسبتاً ٹھنڈی رات دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کررہی تھی۔ نرسری میں ہونے والے واقعے نے جمیل احمد کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کئی پرانے زخموں پر سے کھرنڈ اُتر گئے تھے اور خون رسنے لگا تھا۔ وہ بے دم سے صوفے پر نیم دراز رہے۔ قادر کے بار بار معافی طلب کرنے کے بعد جمیل احمد نے اسے چھوڑ دیا تھا اور ان کے دو ملازم اسے طبی امداد کے لیے ایک کلینک پر لے گئے تھے۔ اعجاز اور نادیہ کو انہوں نے منیجر اشفاق کے سپرد کیا تھا اور اسے ہدایت کی تھی کہ وہ ان دونوں کی ہر ممکن مدد کرے۔

صوفے پر لیٹے لیٹے اچانک جمیل احمد کے دل میں نجانے کیا آیا کہ وہ اُٹھے اور ایک دیوار گیر الماری کی دراز کھول کر وہاں سے ایک البم نکال لائے۔ البم میں کئی پرانی

تصویریں تھیں۔ ان میں سے ہر تصویر جمیل احمد کو ایک کہانی سناتی تھی لیکن ایک تصویر ایسی تھی جس کی سنائی ہوئی کہانی جمیل احمد کو کبھی بھولی نہیں تھی۔ یہ ایک دُبلے پتلے لڑکے بادشاہ کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر تھی۔ برسوں پہلے بادشاہ پر جو بیتی تھی اس نے جمیل احمد کو بھی خون کے آنسو رُلائے تھے اور ان کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ یہ بادشاہ پر بیتنے والے واقعات ہی تھے جنہوں نے جمیل احمد کے روز و شب کو ایک نئی ڈگر پر ڈال دیا تھا اور وہ عام لوگوں سے جدا زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے تھے..... جدا اور یکسر تنہا۔

انہوں نے بادشاہ کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر پر ہاتھ پھیرا اور وہ سب کچھ ان کی نگاہوں میں گھومنے لگا جو تقریباً 35 برس پہلے اس دُبلے پتلے شرمیلے لڑکے پر بیتا تھا۔ بالکل کسی فلم کی طرح ایک ایک منظر جمیل صاحب کے پردۂ تصور پر متحرک ہوگیا۔ وہ چشم دید گواہ کی طرح ان مناظر کو دیکھنے لگے۔

وزیر آباد کے ایک چھوٹے سے مکان میں بادشاہ کی شادی اپنی ہی برادری کی ایک خوبرو لڑکی بلقیس سے ہوئی تھی۔ بادشاہ ایک دفتر میں قاصد تھا۔ اس کا باپ بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ وزیر آباد کے اندرونی علاقے میں اس کی چھوٹی سی دُکان تھی۔ بادشاہ کے آٹھ بہن بھائی تھے۔ چار بھائیوں میں بادشاہ کا نمبر تیسرا تھا۔

شادی کے بعد دُلہا دُلہن کے لیے ایک علیحدہ کمرا ہونا ضروری ہوتا ہے لیکن بڑھئی امام دین کے گھر میں کمرے ہی کتنے تھے۔ دو منزلہ مکان میں کل چار کمرے تھے۔ دس ضرب دس فٹ کے دو چھوٹے کمرے دونوں بھائیوں اور ان کی بیویوں کے پاس تھے۔ باقی دو کمروں میں سے ایک ذرا بڑا تھا۔ اور دوسرے کو کمرے کے بجائے گیلری کہنا زیادہ مناسب تھا۔ اس کی لمبائی گیارہ فٹ کے قریب ہوگی لیکن چوڑائی چھ فٹ سے بھی کم تھی۔ چھت اتنی نیچی تھی کہ بمشکل کھڑا ہوا جا سکتا تھا۔ اس گیلری اور ساتھ والے کمرے میں گھر کے باقی آٹھ افراد بمشکل گزارہ کرتے تھے۔ بوجوہ بادشاہ کی شادی آناً فاناً ہوئی تھی۔ شادی کے مروجہ تقاضے پورے کرنے کے لیے کم از کم ایک علیحدہ کمرا تو ضروری تھا۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کچھ وقت اور کافی سارے پیسے درکار تھے۔ یہ دونوں چیزیں فی الحال امام دین کے پاس نہیں تھیں لہٰذا امام دین نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ، اس کی بیوی، بیٹی اور چھوٹا بیٹا دو چار ہفتے کے لیے چھت پر سو جایا کریں گے۔ اسی دوران میں کسی طرح چھ سات ہزار روپے کا انتظام کر کے چھت پر ایک گزارے لائق کمرا بنا دیا جائے گا۔ اس فیصلے کے بعد نیچے چھت والی


زندگی بدلنے والی ورزش کی مشینیں

KOBE KOREAN
ELECTRIC TREADMILL
The King of All Exercise Machines
LCD-TV کے ساتھ بھی دستیاب
LG موٹر و انورٹر کی طاقت اور انتہائی مضبوط جاپانیز بیلٹ کے ساتھ
آرمی و پبلک جمنازیمز، پرائیویٹ کلبز، اور گھر بھر کے استعمال کیلئے
بعد از فروخت سروس اور پارٹس کی فراہمی کی ضمانت

Great Nordic Track (USA)
V-Flex Space Saver.....
HOME GYMNASIUM MACHINE
انتہائی کم جگہ پر صرف ایک مشین میں مکمل جمنازیم۔ 40 مختلف ورزشوں کیلئے
ہر ورزش کیلئے رہنمائی رنگین ایکسرسائز چارٹ کے ذریعے
تعارفی قیمت پر دستیاب

یاد رکھیے! دائمی صحت برقرار رکھنے کے لئے چند منٹ کی گھریلو ورزش کا کوئی نعم البدل نہیں، ورزش کے کوئی مضر اثرات نہیں

BILAL BROTHERS
Mustafa Arcade, SMCHS, Karachi. Tel: 4531961-62
Be Sure of our Prompt After Sales Service

LAHORE
NABI BUX & SONS
Tel: 7354004

FAISALABAD
ELECTROLUXE
Tel: 8541004-8543436

PESHAWAR
RASHID SONS
Tel: 5272823-5274931

QUETTA
S. K. BUSINESS MART
Tel: 2825564-2839082

marksman

BB-2007/14




Scanned by CamScanner

ڈربا نما گیلری بادشاہ اور اس کی نئی نویلی دُلہن کے حصے میں آ گئی تھی۔

.....آج بادشاہ کی شادی کی پہلی رات تھی۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ گیلری نما کمرے میں موجود تھا۔ اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ وہ سمٹی سمٹائی خوبرو دُلہن کو دیکھتا تو بدن میں سر سے پاؤں تک ایک سنسنی خیز لہر دوڑنے لگتی تھی۔ دُلہن کی مسکراہٹ، اس کی باتیں، اس کے دیکھنے کا شرمیلا انداز، سبھی کچھ بادشاہ کی سانسوں کی لے چڑھا رہا تھا۔ دوسری طرف بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔ وہ ہر گھڑی ایک دوسرے کے قریب آتے جا رہے تھے۔

بادشاہ نے بلقیس کو اپنی بانہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

''دل چاہتا ہے وقت یہیں پر تھم جائے..... کیا تمہارا دل بھی یہی چاہتا ہے۔''

''ہوں۔'' بلقیس نے آنکھیں بند کر کے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

اور پھر وقت واقعی تھم گیا۔ محبت کی یہ پُر جوش کہانی آگے بڑھنے سے پہلے ہی رُک گئی۔ دروازے پر مدھم لیکن بے تاب دستک ہوئی۔

دونوں ٹھٹک کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ بلقیس نے سرخ اوڑھنی سر پر لے لی۔ بادشان نے پوچھا کون؟ اور پھر دروازہ کھول دیا۔ سامنے اس کی والدہ موجود تھی۔ وہ پہلے تو پھیکے سے انداز میں مسکرائی پھر معذرت کے لہجے میں بولی۔

''پتر! بارش شروع ہو گئی ہے۔ اب کیا کریں؟''

بادشاہ کے دل پر گھونسا سا لگا۔ اس کی سہاگ رات برباد ہونے کا اشارہ مل گیا تھا۔ ابا کو بخار بھی تھا۔ وہ اور دوسرے لوگ بارش میں کیسے بھیگ سکتے تھے۔ نیچے دونوں کمروں میں دونوں بھائی اور بھابیاں تھیں۔ ان سے درخواست کرنا فضول تھی۔ ویسے بھی ابا امی اور بادشاہ وغیرہ سے ان کی بول چال بند تھی۔ اب چار و ناچار بادشاہ کو ہی قربانی دینا تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور خوش دلی سے بولا۔ ''امی! اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے۔ آپ چاروں نیچے آ جائیں ناں بلکہ ٹھہریں، ابا کو میں خود ہی لے کر آتا ہوں۔''

وہ زینے پر چڑھتا ہوا مختصر سی چھت پر چلا گیا۔

اگلے دو روز بھی اسی طرح گزر گئے۔ بارش ایک دفعہ شروع ہوئی تو اس نے رُکنے کا نام نہیں لیا۔ مستزاد یہ کہ ساتھ والے کمرے کی چھت بھی ٹپکنے لگی۔ یہاں گھر کا بیشتر سامان بھی پڑا تھا۔ سامان کو تو پوٹھین وغیرہ سے ڈھانپ دیا گیا لیکن کمرے میں سونے کی گنجائش مزید کم ہو گئی۔ بادشاہ کی شادی کو اب تین روز ہونے کو آئے تھے لیکن تنہائی کے اولین ایک گھنٹے کے سوا انہیں ایک دوسرے کو چھونے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ بے تاب نگاہیں ایک دوسرے سے ٹکراتی تھیں، جھکتی تھیں اور پھر ٹکرانے لگتی تھیں۔ بادشاہ کو لگتا تھا کہ ایک نادیدہ دیوار ہے جو دو بے تاب جسموں کے درمیان حائل ہے۔

تیسرے روز خدا خدا کر کے مون سون کا زور کم ہوا اور دوپہر کے وقت دھوپ نکل آئی۔ دھوپ کے ساتھ ہی ان دونوں کے چہرے بھی کھل اُٹھے۔ ایک دوسرے کو دور سے دیکھ کر ہی ان کی سانسوں کی لے تیز ہو جاتی تھی۔

ساتھ والے کمرے کی چھت کو ٹھیک کیا گیا۔ کمرے کی صفائی کر کے اسے سونے کے قابل بنایا گیا۔ ماں کے کہنے پر شام کے وقت بادشاہ نے خود ہی چار عدد چارپائیاں چھت پر پہنچا دیں..... آج رات کے لیے ''حالات'' سازگار ہو رہے تھے۔ بادشاہ کے دل میں ترنگ تھی۔ وہ بات بے بات ہنستا تھا اور بار بار کلائی کی گھڑی دیکھنے لگتا تھا۔ شام اڑیل ٹٹو جیسی ہو گئی تھی۔ آگے کو سرک ہی نہیں رہی تھی۔ بادشاہ کی گرم نگاہیں جب بھی دُلہن کے چہرے پر پڑتی تھیں وہ بے ساختہ شرما جاتی تھی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد بادشاہ نے وقت گزاری کے لیے ریڈیو لگا لیا۔ ماں باپ کی موجودگی میں اپنی دُلہن سے بات کرتے ہوئے بادشاہ کو شرم محسوس ہوتی تھی لہٰذا وہ پاس پاس ہوتے ہوئے بھی خاموش رہتے تھے۔ نو بجے کا وقت ہو گا جب گھر کے عین سامنے تانگہ رُکنے کی آواز آئی پھر دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگا۔ دروازے کے ساتھ ہی بادشاہ کا دل بھی دھڑ دھڑ بجنے لگا۔ یہ مہمانوں کی آمد کا اشارہ تھا۔ یہ اشارہ بالکل دُرست ثابت ہوا۔ بادشاہ کے ماموں اور ممانی اپنے پانچ عدد بچوں اور ڈھیر..... سارے سامان کے ساتھ تشریف لے آئے تھے۔ وہ ایک قریبی قصبے حیات آباد کے رہنے والے تھے۔ معلوم ہوا کہ مسلسل بارشوں کے سبب ڈیک نالے میں طغیانی آ گئی ہے اور سیلابی پانی اردگرد کے دیہات میں داخل ہو گیا ہے۔

یہ سیلابی پانی درحقیقت بادشاہ کے ''ارمانوں کی بستی'' میں داخل ہوا تھا اور اس کی اُمیدوں پر پھرا تھا۔ آناً فاناً گھر کی بالائی منزل پر چہل پہل ہو گئی اور نیم عریاں بچوں کی چہکاریں گونجنے لگیں۔ گیلری اور سہاگ رات ایک بار پھر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے..... جہاں پُر جوش محبت کی سرگوشیاں گونجتی تھیں، وہاں بچے ''دمادم مست قلندر'' کرنے لگے۔



Scanned by CamScanner

بادشاہ اور بلقیس ایک بار پھر ٹھنڈی سانسیں لے کر رہ گئے تھے۔

مرد و زن کی محبت کی ادائیں عجیب ہوتی ہیں۔ دوری..... تڑپ کو بھڑکاتی اور طلب کو شدت دیتی ہے۔ بادشاہ بھی اپنی ''ملکہ'' کی جدائی میں تڑپ تڑپ جا رہا تھا۔ یہ کیسا بادشاہ تھا اور یہ کیسی ملکہ تھی۔ وہ ایک ہونے کے باوجود ایک نہیں تھے۔ انہیں ازدواجی رشتے میں منسلک ہوئے کئی دن گزر چکے تھے لیکن وہ ''اپنے محل میں'' ندی کے دو کناروں کی طرح ایک دوسرے سے دور تھے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ مہمانوں کی آمد کے تیسرے روز بادشاہ کو ایک گوشۂ تنہائی نظر آیا۔ چھت کو جانے والی تنگ سیڑھیاں دن کے وقت بھی کافی تاریک ہوتی تھیں۔ اگر وہ ان سیڑھیوں میں جا کر کھڑا ہو جاتا اور بعد میں بلقیس بھی ذرا ہوا کھانے کے بہانے اُوپر آ جاتی تو وہ سیڑھیوں میں کھڑے ہو کر کم از کم گلے تو مل سکتے تھے۔

اس روز بادشاہ نے اس منصوبے پر عمل کیا۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں بلقیس کو سمجھایا اور پھر سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ پہلے وہ چھت پر گیا پھر خم دار سیڑھیوں میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اسے چوڑیوں کی مدھم کھن کھن سنائی دی۔ اس کا دل بلیوں اُچھل گیا۔ وہ آ رہی تھی پھر خوشبو کے ایک جھونکے کے ساتھ وہ سیڑھیوں کی تاریکی میں داخل ہو گئی۔ ڈری سہمی ہوئی جیسے چوری کر رہی ہو۔

بادشاہ نے اس کے ہاتھ تھامے۔ وہ تپ رہی تھی۔ اس کی سانس سہمی ہوئی لیکن تیز تھی۔ بادشاہ نے اسے بانہوں میں لے لیا۔ ''تم ٹھیک ہو ناں؟'' بادشاہ نے پوچھا۔

''ہوں۔'' اس نے بادشاہ کے سینے پر سر کو جنبش دی۔

''بس تھوڑا سا انتظار اور کرنا پڑے گا۔'' بادشاہ نے لرزتی آواز میں کہا۔

وہ خاموش رہی۔ بادشاہ نے اپنے جلتے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔ اچانک وہ دونوں یوں اُچھلے جیسے ان کے جسم ہزاروں وولٹ کے برقی تار سے چھو گئے ہوں۔ بلقیس گرتے گرتے بچی۔ اس گوشۂ تنہائی میں وہ اکیلے نہیں تھے۔ ماموں کا منجھلا، نہایت شریر بیٹا بھی یہاں موجود تھا۔ وہ غالباً تین چار منٹ پہلے آنکھ مچولی کھیلتا ہوا یہاں آ دبکا تھا۔ اب وہ شوخ وہاں سے چلاتا ہوا بھاگا اور باہر چھوٹے سے برآمدے میں جا کھڑا ہوا۔ بلقیس جلدی سے سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر چلی گئی۔ بادشاہ ہانپتا کانپتا ہوا نیچے آ گیا۔ ماموں کا بیٹا اب برآمدے میں کھڑا تھا اور شرارتی نظروں سے بادشاہ کو تک رہا تھا۔ ممانی بار بار اس سے پوچھ رہی تھی۔ ''کیا ہوا تنویر..... کیا ہوا؟''

بادشاہ اپنی خجالت اور برہمی چھپاتا ہوا باہر چلا گیا۔

..... مہمانوں کے جانے کے آثار ابھی دور دور تک نہیں تھے۔ بادشاہ کو کوئی گوشۂ عافیت نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے سسرال کا گھر تو اس کے گھر سے بھی چھوٹا تھا۔ صرف دو مرلے میں بنا ہوا ایک منزلہ مکان جس میں لیٹرین اور کچن کے درمیانی ''فاصلے'' کے بارے میں کہا جا سکتا تھا ہر چند کہیں، ہے نہیں ہے۔ اس ڈربا نما مکان میں دس افراد ایک دوسرے کے اُوپر لد کر رہتے تھے۔

جوں جوں بادشاہ کا بلقیس سے ملنا مشکل ہو رہا تھا، توں توں اس کی بے تابی اور جھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ان بن بلائے مہمانوں میں سے ایک ایک کا گلا گھونٹ کر باہر پھینک دے۔ دوپہر کو سیڑھیوں والے واقعے کے بعد بادشاہ کے ذہن میں ایک اور ترکیب آئی۔ شب عروسی تو بادشاہ کی پہنچ سے کافی دور تھی، تاہم ملن کی چند گھڑیاں بھی اب اس کے لیے اہمیت رکھتی تھیں۔ شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ شام کے وقت بلقیس کو ساتھ لے کر گھومنے کے لیے نکل گیا۔ دراصل اس کا پروگرام فلم دیکھنے کا تھا۔ وہ سنیما ہال کی تاریکی سے تھوڑا بہت فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔ نیا نویلا جوڑا ایک رکشا پر سنیما پہنچا۔ بلقیس سیڑھیوں والے واقعے کے بعد کچھ خجل اور شرمندہ سی تھی۔ لوگ اچھی فلم دیکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں لیکن بادشاہ فلاپ فلم دیکھنے کا خواہش مند تھا تاکہ رش کم سے کم ہو اور اسے ہال کی سب سے پچھلی نشستوں پر جگہ مل سکے مگر حالات کو انسانی ارادوں سے ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ سنیما میں انہیں آخری قطار میں جگہ نہیں مل سکی۔

تاریکی ہونے کے بعد بادشاہ نے اپنا کندھا اپنی دُلہن کے کندھے سے ملا دیا اور اس کا ہاتھ بڑی وارفتگی سے دُلہن کے نصف عریاں بازوؤں پر حرکت کرنے لگا۔ اس کے ہونٹ خشک ہو گئے اور دھڑکن کئی گنا بڑھ گئی۔ شاید دوسری طرف بھی یہی کیفیت تھی تاہم یہ طلسم بھی جلد ہی ٹوٹ گیا۔ بادشاہ اور بلقیس کی عقبی نشستوں پر اوباش لڑکوں کی ایک ٹولی بیٹھی تھی۔ وہ بار بار آوازے کس رہے تھے اور گانوں کے بولوں پر خوش ہو کر بھڑکیں مار رہے تھے۔ ان میں سے کسی کو غالباً بھنک پڑ گئی تھی کہ بادشاہ اور بلقیس فلم سے لطف اندوز ہونے کے بجائے ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ وہ



Scanned by CamScanner

ذومعنی باتیں کرنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ''اسٹوری ہے بھئی اسٹوری ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''لو اسٹوری ہے۔''

ایک دبی دبی آواز سنائی دی۔ ''باکس میں جاؤ بھئی باکس میں جاؤ۔''

''پیسے نہیں تو ہم سے لے لو۔'' دوسری آواز نے لقمہ دیا۔

بادشاہ کا سارا نشہ ہرن ہوگیا۔ وہ بلقیس سے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ بلقیس بھی پتھر کا بت بن گئی۔ انٹرول تک گاہے بگاہے ذومعنی جملے بادشاہ کے کانوں میں پڑتے رہے۔ اس نے ایک عقل مندی کی کہ انٹرول سے تھوڑی دیر پہلے ہی وہ بلقیس کے ساتھ اُٹھ کر باہر آ گیا۔

انہوں نے ایک جگہ سے دہی بڑے کھائے ایک جگہ سے ربڑی والا دودھ پیا۔ یوں سینما ہال کی کوفت تھوڑی سی کم ہوئی۔ رات نو بجے کے قریب وہ گھر واپس آ گئے۔ گھر جہاں ہر طرف مکین تھے اور کوئی جائے امان نہیں تھی۔ رات کو بھی بادشاہ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کا سارا جسم جیسے بخار کی زد میں تھا۔ دماغ گھن چکر بنا ہوا تھا۔ عجیب منصوبے دماغ میں بن اور بگڑ رہے تھے۔ وہ بس بلقیس کے ساتھ کچھ دیر کی مکمل تنہائی چاہتا تھا۔ تنہائی جو اس افلاس کی ماری زندگی میں کہیں نہیں تھی۔ دماغ منصوبے بناتا رہا۔ ان میں ایسے واہیات منصوبے بھی تھے جو عام حالات میں بادشاہ کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتے تھے مثلاً باتھ روم کا منصوبہ۔ وہ سوچ رہا تھا بلقیس کسی وقت باتھ روم میں جائے تو اس کے پیچھے وہ بھی وہاں پہنچ جائے۔ دروازے کی درز سے ہونٹ لگا کر سرگوشی کرے اور بلقیس کو دروازہ کھولنے کا کہے..... لیکن کیا باتھ روم میں اتنی جگہ.....؟

''نہیں..... نہیں..... یہ ٹھیک نہیں۔'' اس نے دل ہی دل میں اپنے خیال کو رد کیا۔

''اور پھر باتھ روم..... باتھ روم ہی ہوتا ہے۔ ہلکی سی بو بھی ہوتی ہے..... اور گیلا فرش۔ نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔ بلقیس نے تو پھولوں کی سیج اور گلاب کی لڑیوں کے سپنے دیکھے ہوں گے اور پھر اگر کسی نے دروازہ کھٹکھٹا دیا اور وہیں کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگا تو..... نہیں بالکل نہیں۔'' اس نے جھرجھری لے کر یہ خیال ذہن سے نکال دیا۔

صبح ہوئی تو اسے اپنے رات والے خیالات پر کچھ زیادہ ہی شرمندگی محسوس ہوئی۔ وہ سودا سلف لینے کے لیے سیڑھیاں اُتر کر نیچے جا رہا تھا جب اس کا سامنا چھوٹی بھابی سے ہوا۔

یوں تو دونوں بھابیاں اس سے بات نہیں کرتی تھیں تاہم چھوٹی بھابی کا رویہ قدرے اچھا تھا۔ چھوٹی بھابی اسے دیکھ کر زیرِ لب مسکرائی اور شرارتی انداز میں بولی۔ ''کیا بات ہے؟ آج کل تو ہر وقت سیڑھیوں پر ہی نظر آتے ہو۔''

بادشاہ ایک لحظے میں بات کی تہ تک پہنچ گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ کل والی بات گھر میں پھیل گئی تھی۔ آٹھ سالہ تنویر نے اسے بلقیس کے ساتھ اندھیری سیڑھیوں میں دیکھا تھا اور اب یہ واقعہ سب کو معلوم ہو چکا تھا۔

بادشاہ فطرتاً شرمیلا اور کم گو تھا۔ اپنے آپ میں پسینے پسینے ہوگیا۔ کچھ دیر بعد اس نے بڑے بھائی کو دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں بھی اسے طنز اور تحقیر کے آثار نظر آئے۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہتے ہوئے گزر گئے۔ ''کیوں گھر کا ماحول خراب کر رہے ہو۔ ذرا صبر کر لو۔''

دوپہر کو تو تنویر کی بات سن کر بادشاہ کا پارہ بالکل ہی چڑھ گیا۔ وہ اپنی بٹنوں جیسی گول آنکھیں گھما کر شوخی سے بولا۔ ''بھائی جان! آپ باجی سے چما چما کھیل رہے تھے۔''

''دفع ہو جا!'' بادشاہ دہاڑا اور اس کے ساتھ ہی جوتی اس پر کھینچ ماری۔

جوتی اس کے منہ پر لگی اور نچلے ہونٹ سے تھوڑا سا خون نکل آیا۔ ممانی نے بات کا بتنگڑ بنا لیا اور بادشاہ کو برا بھلا کہا۔ ان کا ایک فقرہ بادشاہ کے کانوں میں زہر گھول گیا۔ انہوں نے بادشاہ کی والدہ سے کہا۔ ''آپاں! میں اب نہیں رہوں گی یہاں۔ تیرے پتر کو مستی چڑھی ہوئی ہے۔ اس مستی میں کسی کی جان ہی نہ لے لے۔''

والدہ نے بادشاہ کو برا بھلا کہا اور اس معاملے کو بڑی مشکل سے سنبھالا لیکن سیڑھیوں والی بات پتا نہیں کیسے گھر سے باہر تک چلی گئی تھی۔ رات کو تندور سے روٹیاں لے کر آتے ہوئے بادشاہ کی ملاقات پڑوسی کے لڑکے ''مٹھائی فروش مجید'' سے ہوئی۔ وہ بادشاہ کا کندھا دبا کر بے تکلفی سے بولا۔ ''بادشاہ سلامت! سنا ہے آج کل سیڑھیوں میں مزے لے رہے ہو۔''

بادشاہ کا دماغ گھوم گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا کہ مجید کے منہ پر تھپڑ جڑ دے لیکن پھر نہ جانے کس طرح اس نے خود کو سنبھالا اور مجید کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ مجید اسے قدرے حیرت سے دیکھتا رہا۔

وہ رات بھی بادشاہ نے سخت بے چینی کے عالم میں گزاری۔ گیلری میں چھ افراد سو رہے تھے۔ ان چھ افراد میں



Scanned by CamScanner

اس کی منکوحہ بیوی بھی تھی لیکن ان دونوں کے بستر ایک دوسرے سے قریباً سات فٹ کی دوری پر تھے۔ سات فٹ کے اس خلا میں فرشی بچھونوں پر چار افراد سو رہے تھے۔ وہ دونوں فاصلے سے ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور بس دیکھ کر رہ جاتے تھے پھر بلقیس بھی سو گئی۔ وہ جاگتا رہا، سوچتا رہا کہ ایک ہی خدا کی مخلوق ہونے کے باوجود انسانوں کی قسمت اتنی مختلف کیوں ہوتی ہے۔ سوچتے سوچتے اسے اُونگھ آ گئی۔ اسی اُونگھ میں اس کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب منظر آیا۔ اسے لگا کہ بے شمار لوگ اس کی طرف طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے گزر رہے ہیں، مسکرا رہے ہیں، ٹھٹھا کر رہے ہیں۔ ان کی اُنگلیاں اس کی طرف اُٹھ رہی ہیں۔ ہونٹ ہل رہے ہیں مگر آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچتی لیکن وہ سب کچھ سمجھ رہا ہے..... پھر اس نے دیکھا کہ محلے کی دیواروں پر چاکنگ کی گئی ہے۔ ''سیڑھیوں میں سہاگ رات'' ہر جگہ ہر گلی میں یہی فقرہ لکھا دکھائی دے رہا ہے۔ ''سیڑھیوں میں..... سیڑھیوں میں'' وہ ہڑبڑا کر رہ گیا اور فرشی بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ لاہور کا رُخ کرے گا۔

☆☆☆

لاہور میں بادشاہ کا ایک دور کا رشتے دار رمضان علی رہتا تھا۔ وہ ایک سرکاری دفتر میں کلرک تھا لیکن اس کا ذاتی گھر تھا اور موٹر سائیکل بھی تھی۔ اس نے بادشاہ سے کئی بار کہا تھا کہ وہ قاصد کی معمولی نوکری چھوڑ کر لاہور آ جائے۔ یہاں وہ اسے کسی پرائیویٹ فرم میں دُگنی تنخواہ پر رکھوا دے گا۔

سیڑھیوں والے واقعے کے کوئی تین چار دن بعد بادشاہ نے بلقیس کو اپنے ساتھ لیا اور لاہور روانہ ہو گیا۔ اس نے ٹیلی فون پر رمضان سے رابطہ کر لیا تھا اور رمضان نے اسے اُمید دلائی تھی کہ نوکری مل جائے گی۔ بادشاہ نے گھر والوں کو یہی بتایا کہ نوکری مل گئی ہے۔ وہ وزیر آباد سے روشنیوں کے شہر لاہور پہنچا تو پتا چلا کہ نوکری کے لیے تھوڑی سی بھاگ دوڑ بھی کرنا پڑے گی۔ یہاں رمضان علی کے گھر میں بھی وہی مسئلہ تھا۔ تین مرلے کے گھر میں اُوپر کی منزل کرائے پر تھی۔ نچلی منزل پر آٹھ نو افراد قیام پذیر تھے۔ بادشاہ اور بلقیس کو سونے کے لیے برآمدے میں جگہ ملی۔ علیحدہ رہائش کی منزل ابھی دور تھی۔ پہلے نوکری کا مسئلہ حل ہونا تھا۔

ایک شام بادشاہ اور بلقیس لاہور کے چڑیا گھر کی سیر کو گئے۔ وہاں سے وہ لارنس گارڈن چلے گئے۔ وہ گارڈن کی بھول بھلیوں میں گھوم رہے تھے جب بارش شروع ہو گئی۔ وہ پہاڑی کے درختوں میں آ چھپے۔ بارش کی پھوار پتوں سے چھن چھن کر ان کے جسموں کو بھگو رہی تھیں۔ اردگرد کوئی نہیں تھا۔ نیم تاریکی میں یہ جگہ بہت تنہا اور رومان انگیز محسوس ہوئی۔ وہ پتھر کی ایک شکستہ بینچ پر بیٹھے رہے۔ ان کے ہاتھ ایک دوجے سے اُلجھ رہے تھے۔ بارش تواتر سے برستی جا رہی تھی۔ بلقیس ایک آہ کھینچ کر پتھریلی بینچ پر نیم دراز ہو گئی۔ اس نے درخت سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ بادشاہ نے اسے بانہوں میں لے لیا۔ وہ ہر اندیشے کو بالائے طاق رکھ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جانا چاہتا تھا..... لیکن پھر اچانک ایک ٹارچ کی تیز روشنی نے دونوں کو لرزا دیا۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' ایک آواز نے گرج کر پوچھا۔

ٹارچ کے عقب میں دو تین افراد دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دونوں مجرموں کی طرح سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

چوکیدار نما شخص نے لاٹھی سے بادشاہ کی ٹھوڑی کو اُونچا کیا۔ ''اوئے لفنگے! یہ کیا لگتی ہے تیری؟''

''یہ..... یہ میری بیوی ہے۔''

''واہ..... واہ..... بیوی ہے۔'' چوکیدار نے نقل اُتاری۔ ''بیوی ہوتی تو گھر میں ہوتی۔ یہاں تیرے ساتھ درختوں میں نہ گھسی ہوتی۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' بادشاہ نے کہا۔

''اوئے بکواس نہ کر!'' ایک لمبے تڑنگے شخص نے بادشاہ کے منہ پر زناٹے کا تھپڑ مارا۔ ''جھاڑیوں میں بیویاں نہیں ہوتیں، معشوقیں ہوتی ہیں۔ تیرے جیسے بڑے ''خاوند'' دیکھتے ہیں ہم سارا دن۔''

''نکاح نامہ کدھر ہے تیرا؟'' تیسرے شخص نے بادشاہ کو گدی سے دبوچتے ہوئے کہا۔

اس موقع پر بلقیس نے بھرائے ہوئے لہجے میں صفائی پیش کی۔ ''ہم میاں بیوی ہیں۔ سیر کے لیے آئے تھے۔''

''کرا لیتے ہیں تم دونوں کو سیر بھی۔'' دوسرے شخص نے کہا۔ وہ تینوں میں سب سے سخت گیر نظر آتا تھا۔ اس کے کندھے سے پستول لٹک رہا تھا۔

بادشاہ اور بلقیس نے منت سماجت کی لیکن انہوں نے ایک نہیں سنی اور انہیں ہانک کر ایک بڑے نیچے میں لے آئے۔ پستول والا خود کو پولیس افسر ظاہر کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ ہال میں سرِعام فحش حرکات کرنے والے جوڑوں کے خلاف مہم چلی ہوئی ہے اور وہ جوڑوں کو پکڑ پکڑ کر حوالات میں بند کر رہے ہیں۔ اس نے کہا۔ ''بالفرض اگر تم میاں بیوی بھی

ہو تو سرِ عام نازیبا حرکات کے جرم میں تمہیں اندر کیا جا سکتا ہے۔"

لرزتی کانپتی بلقیس ان کے سامنے ہاتھ جوڑنے لگی اور منت سماجت کرنے لگی۔ اس کی منت سماجت نے ان لوگوں کو مزید شیر کر دیا۔ انہوں نے بادشاہ کو حکم دیا کہ وہ دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر خیمے کے ایک کونے میں کھڑا ہو جائے۔ بادشاہ نے بات ماننے سے انکار کیا تو دو افراد اس پر پل پڑے۔ اچانک اس کے سر کے عقبی حصے پر کوئی وزنی چیز لگی۔ آنکھوں کے سامنے ستارے سے ناچے اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

بادشاہ کو دوبارہ ہوش آیا تو وہ لارنس گارڈن سے کچھ فاصلے پر گنگا رام اسپتال میں تھا۔ دو نامعلوم آدمی اسے ایمرجنسی وارڈ میں ڈال کر چلے گئے تھے۔ ہوش میں آتے ہی وہ اپنی بیوی کے لیے دُہائی دینے لگا لیکن بیوی کہیں نہیں تھی۔ وہ نیم دیوانہ ہو گیا..... اپنے دوست رمضان علی کے ساتھ پولیس اسٹیشن پہنچا۔ وہاں کچی رپورٹ لکھی گئی۔ لارنس گارڈن میں تلاش کیا گیا لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ واقعے کو اب اٹھارہ گھنٹے سے زائد گزر چکے تھے۔ جائے وقوعہ پر ایک بڑا خیمہ موجود تھا لیکن وہ تین ہفتوں سے خالی پڑا تھا۔ نہ ہی باغ کے اس مبینہ چوکیدار کا سراغ ملا اور نہ ہی جوڑوں کے خلاف چلائی جانے والی اس مہم کی تصدیق ہوئی۔ ایسی ایک مہم کچھ عرصہ پہلے چلائی گئی تھی اور دو ماہ پہلے ختم ہو چکی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی جرائم پیشہ لوگ تھے جنہوں نے یادو باران کی اس رات کا فائدہ اُٹھایا تھا۔ وہ لوگ بادشاہ کو زخمی کر کے اسے بیوی سے محروم کر گئے تھے۔ یہ بادشاہ کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔

بادشاہ کئی ماہ تک بلقیس کی تلاش میں دربدر بھٹکتا رہا۔ کون سا دروازہ تھا جو اس نے نہیں کھٹکھٹایا۔ کون سی کوشش تھی جو اس نے نہیں کی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ایک اندھیر نگری کا باسی ہے جہاں کوئی شنوائی نہیں، جہاں ہر طرف نارسائی ہے۔

پھر کیا ہوا تھا؟ پھر یہ ہوا تھا کہ دھیرے دھیرے وقت گزرتا رہا تھا۔ وقت جو ہر زخم کا مرہم ہے لیکن کچھ زخم بہت دیر تک ہرے رہتے ہیں۔ ان میں سے لہو رستا رہتا ہے۔ بلقیس کی گمشدگی کا زخم بھی ایسا ہی تھا۔ جب بھی اس کی یاد ذہن میں آتی تھی بادشاہ خود کو دنیا کا بدقسمت ترین شوہر سمجھنے لگتا تھا۔ وہ شوہر جو اپنی لو بیاہتا بیوی کو ایک چھت اور چار دیواری بھی نہ دے سکا۔ وہ خلوت کی چند گھڑیوں کے لیے ترستا رہا اور وہ بھی خلوت کی چند گھڑیوں کے لیے ترستی ہوئی چلی گئی۔

..... بیوی کی جدائی کے تین چار سال بعد بادشاہ کی مالی حالت بہتر ہونا شروع ہوئی۔ اس نے اپنی تنخواہ جمع کر کر کے ایک پلاٹ خرید رکھا تھا۔ اس پلاٹ سے اسے غیر متوقع منافع ہوا۔ اس نے تین چار چھوٹے پلاٹ مزید خرید لیے اور ایک دوست کے ساتھ مل کر ان پر کنسٹرکشن شروع کر دی۔ اس کا کام تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ بادشاہ کا اصل نام جمیل احمد تھا۔ بادشاہ اس کی عرفیت تھی۔ ہاں یہی جمیل احمد تھا جو آنے والے دنوں میں شہر کا سب سے بڑا اسٹیٹ ڈویلپر بننے والا تھا۔ اس کی قسمت میں عجیب سا پھیر آیا تھا۔ وہ جس شے کو ہاتھ لگاتا گیا وہ سونا بنتی گئی۔ اس نے رہائشی مکانات بنانے شروع کر دیے۔ رہائشی مکانات ڈیزائن کرنے اور انہیں مکمل کرنے میں بادشاہ یعنی جمیل احمد کو عجیب سا سکون ملتا تھا۔ شاید یہ کوئی اندرونی حسرت تھی جس کی تسکین چھت اور چار دیواری کی تکمیل سے ہوتی تھی۔ اس کا کاروبار پھیلا۔ اس نے وسیع و عریض کوٹھیاں بنائیں، رہائشی کالونیاں تعمیر کیں۔ لاہور کے دل میں اپنے لیے ایک شاندار رہائش گاہ تعمیر کی..... جس کے درجنوں خوبصورت کمرے تھے..... وہ ان خوبصورت کمروں میں گھومتا تھا اور کسی کا انتظار کرتا تھا لیکن جس کا انتظار کرتا تھا وہ کہیں نہیں تھا۔ جانے والے اتنی آسانی سے واپس تو نہیں آتے۔ بہرحال اس نے کسی نہ کسی طور بلقیس کی تلاش تا حال جاری رکھی ہوئی تھی۔ ایک موہوم اُمید کے سہارے وہ ہر سال لاکھوں روپیا اس کی تلاش پر لٹا دیتا تھا۔

..... اس طرح پچیس سال گزر گئے اور پھر ایک روز جمیل احمد کی تلاش بارآور ہوئی۔ اسے بلقیس ملی لیکن کہاں؟ ایبٹ آباد کے قریب ایک قبرستان میں۔ اس کے بارے میں اطلاع دینے والا ایک ایسا شخص تھا جس نے ایبٹ آباد کی پبلک لائبریری میں بیٹھے بیٹھے ایک برسوں پرانے اخبار میں بلقیس کی تصویر دیکھی۔ یہ تصویر گمشدگی کے اشتہار کے ساتھ شایع ہوئی تھی۔ یہ شخص اس گاؤں کا باسی تھا جس گاؤں میں بلقیس اپنے اغوا کے چار سال بعد تک زندہ رہی تھی۔ ہاں وہ لارنس گارڈن والی رات کے بعد صرف چار سال زندہ رہی تھی اور وہ پچیس سال تک اس کا انتظار کرتا رہا تھا۔ یہی انسان کی بے خبری ہے اور یہی انتظار کی سفاکی۔

جمیل احمد کو جو کچھ معلوم ہوا اس سے پتا چلا کہ جلال نامی ایک شخص نے بلقیس سے باقاعدہ بیاہ کر رکھا تھا۔ وہ اس کے دو بچوں کی ماں تھی۔ گو جلال احمد مزاج کا سخت تھا لیکن اس نے شوہر کی حیثیت سے بلقیس کو پورا پورا تحفظ اور عزت دے



Scanned by CamScanner

رکھی تھی۔ اپنی بیوی پر بری نظر ڈالنے والے اپنے ایک دوست کا ہاتھ اس نے کلائی پر سے کاٹ کر پھینک دیا تھا۔ گاؤں میں کہا جاتا تھا کہ جلال اس عورت کو کہیں سے بھگا کر لایا ہے۔ کچھ کا خیال تھا کہ اس نے یہ عورت خریدی ہے۔ ایک ماں کی حیثیت سے بلقیس کو اپنے دونوں بچوں سے محبت تھی۔ ایک رات اس کا بڑا بیٹا سخت بیمار ہوگیا۔ وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ٹریکٹر پر سوار ہوکر مانسہرہ کے اسپتال کی طرف جارہی تھی کہ ٹریکٹر حادثے کا شکار ہوگیا۔ ایک تیز رفتار ٹرک کی ٹکر سے بلقیس اور دونوں بچے موقع پر جاں بحق ہوگئے جبکہ جلال مانسہرہ کے سرکاری اسپتال میں چل بسا۔ اب بلقیس شہرِ خموشاں کی باسی تھی۔ اس کی پتھروں سے سجی ہوئی قبر پر ''نور بانو'' کے نام کا کتبہ لگا ہوا تھا۔ یہ وہ نام تھا جو اس کے مجازی خدا جلال نے اسے دیا تھا۔ بس یہی تھی بلقیس کی کہانی۔

☆☆☆

جمیل احمد اپنے وسیع بیڈروم میں صوفے پر نیم دراز تھے۔ البم ابھی ان کے ہاتھ میں تھی۔ ان کی نگاہیں دُبلے پتلے لڑکے بادشاہ کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر پر تھیں۔ اس ''لڑکے'' کی کہانی نے ان کی زندگی بدلی تھی اور یہ ان کی اپنی کہانی ہی تھی۔

جمیل احمد کی نرم پوروں نے دھیرے دھیرے تصویر کو چھوا۔ اس کے ساتھ ہی دُلہن بنی بلقیس کی تصویر تھی۔ وہ بلقیس کی تصویر کو چھونے لگے۔ وہ لڑکی جسے کبھی واپس نہیں آنا تھا لیکن جو ہمیشہ کے لیے ان کے دل میں براجمان ہوچکی تھی۔ بھیگی بھیگی راتوں میں اس کا تصور آج بھی جمیل احمد کے سامنے آن موجود ہوتا تھا۔ وہ حسرت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھتی تھی۔ وہ اس سے کہتے تھے۔ ''تم کہاں ہو بلقیس! دیکھو آج میں بے گھر نہیں ہوں۔ آج میرے پاس کتنے کمرے ہیں، کتنی کھڑکیاں کتنے دروازے اور کتنے پھول۔ ایک بار آجاؤ..... بس ایک بار۔''

لیکن جانے والے آتے نہیں ہیں۔ بلقیس بھی بس ان کی طرف دیکھتی ہی رہتی تھی۔

آج پتا نہیں کیا بات تھی۔ جمیل احمد کو اپنا درد ہمیشہ سے سوا محسوس ہوا۔ کئی پرانے زخموں سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ آج پھر یہ درجنوں کمروں والا ''روم ہاؤس'' انہیں کھانے کو دوڑنے لگا..... وہ سوچنے لگے۔ کیوں بنائے تھے میں نے یہ کمرے؟ یہ کس کا انتظار کررہے ہیں؟ یہاں کسی نے نہیں آنا اور نہ کوئی آسکتا ہے۔ طویل تاریک راتوں میں یہ قطار اندر قطار کمرے کسی طرح بدروحوں کے مسکن نظر آتے رہیں گے..... ان میں کبھی زندگی نہیں مسکرائے گی۔

وہ بے چین سے ہوکر ٹہلنے لگے۔ کبھی ایک کمرے میں کبھی دوسرے میں۔ ان کی بوڑھی آنکھیں نم تھیں۔ اچانک..... بالکل اچانک ایک خیال ان کے ذہن میں آیا۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ان کے اندر سے آواز آئی۔ ''جمیل احمد! تم اپنے گئے وقت کو آواز دے سکتے ہو۔ ایک نئے انداز سے ایک نئے رنگ سے۔'' وہ دیر تک بیٹھے سوچتے رہے۔ ان کی آنکھوں کی چمک بڑھتی رہی۔ ایک بلقیس گم ہوگئی تھی لیکن ایک بلقیس ابھی گم نہیں ہوئی تھی..... اور کئی بلقیسیں ابھی گم نہیں ہوئی تھیں۔

انہوں نے تیزی سے اپنا سیل فون نکالا۔ ''ہیلو اشفاق! میں جمیل احمد بول رہا ہوں۔''

''جی سر!'' منیجر اشفاق کی چوکس اور مؤدب آواز سنائی دی۔

''وہ دونوں بچے کہاں ہیں۔ اعجاز اور نادیہ۔''

''جی، میں نے بڑی کوشش کی ہے لیکن اعجاز کا کلاس فیلو نہیں ملا۔ پتا نہیں وہ لاہور میں ہے بھی یا نہیں۔''

''میں نے تم سے پوچھا ہے وہ دونوں کہاں ہیں؟'' جمیل احمد نے دھاڑ کر پوچھا۔

''وہ دونوں اب ملتان جانے کا کہہ رہے تھے۔ وہاں اعجاز کا کوئی رشتے دار.....''

''میں پوچھتا ہوں وہ دونوں اب..... اب کہاں ہیں؟'' جمیل صاحب پھر دھاڑے۔

''ابھی وہ میرے ساتھ ہی ہیں۔''

جمیل احمد نے طویل سانس لی۔ ''انہیں لے کر فوراً..... میرے پاس پہنچو.....''

سیل فون بند کرکے ان کے چہرے پر خوشی ہی خوشی پھیل گئی۔ دو نوکر موجود تھے لیکن انہوں نے خود ہی ''روم ہاؤس'' میں بھاگ بھاگ کر تمام کمروں کی لائٹس آن کیں اور تھوڑی ہی دیر میں پورے گھر کو بقعۂ نور بنادیا۔

اعجاز اور نادیہ قریباً ایک گھنٹے بعد روم ہاؤس پہنچے۔ ان کے آنے سے پہلے ہی جمیل احمد روم ہاؤس کا نیا نام سوچ چکے تھے۔ اب اس عظیم الشان عمارت کا نیا نام ''یوتھ ہاؤس'' ہونا تھا۔ اس عمارت کو اب مزید بڑھنا اور پھیلنا تھا اور اس میں ایسے نوجوان جوڑوں کو پناہ ملنا تھی جن کو واقعی پناہ کی ضرورت تھی۔ انہیں محسوس ہوا کہ بلقیس ان کے اردگرد کہیں موجود ہے..... اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ہیں۔

❖



Scanned by CamScanner